

سلسلہ انجمن اشاعت اردو نمبر (۱)

دوول و مسلمانوں کے تعلقات

رائٹ سٹینریل سراجہ جیری کا ایک مقالہ

ناشر

تصدق حسین تاج

سلسلہ انجمن اشاعت اردو نمبر (۱)

ہندوؤں و مسلمانوں کے تعلقات

فہرست انٹرنیٹ سیرکبر حیدری کا ایک مقالہ

تصدق حسین تاج

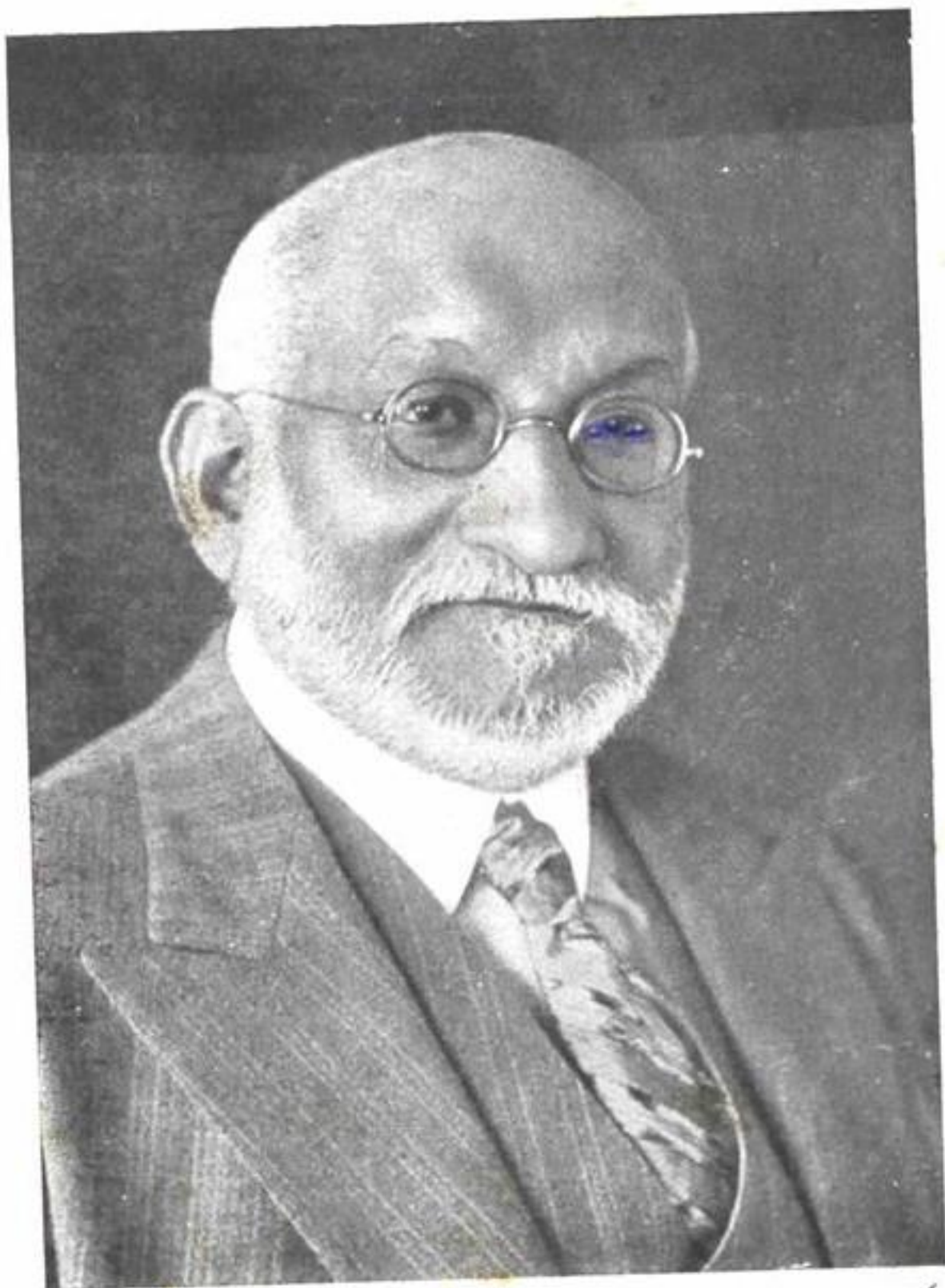
مفتد انجمن اشاعت اردو حیدرآباد دکن

مطبعہ

احمدیہ پریس حیدرآباد دکن

۱۹۳۸ء

قیمت ۲۰



ہذا کسٹنس رائیٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر
 پی۔سی۔، ڈی۔سی۔ ال۔ ال۔ ڈی۔ (عثمانیہ)
 ال۔ ال۔ ڈی۔ (مدرس) صدر اعظم باب حکومت

تمہید

ہنراکسنی رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے
ازراہ لطافت و عنایات میری درخواست پر اپنے گراں بہا خطبات و
مقالات کو بصورت کتاب شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔
مقام مسرت ہے کہ یہ مجموعہ بحسن و خوبی مرتب ہو کر طبع ہو رہا ہے۔ اس
مجموعہ میں ایک مقالہ ایسا ہے جس کے مباحث ہندو مسلم اتحاد سے
تعلق رکھتے ہیں۔ حال میں بیرونی تحریکات کے باعث ہندو مسلم تعلقات
کی جو فضا مسموم و مکدر ہو گئی تھی اور جس کے نتائج نے فتنہ و فساد برپا
کر دیا تھا ان حالات و اثرات کے مد نظر اس مقالہ کا مجموعہ سے علیحدہ
شائع کرنا نہایت ضروری معلوم ہوا۔

یہ مقالہ آج سے سینتیس سال پہلے ۱۹۰۱ء میں لکھا گیا تھا۔
جسٹس رانا ڈے آنجہانی کے مشورہ اور ان کی تحریک سے مسٹر خٹیا
نے ہندوستان کی اصلاح معاشرت پر ایک مجموعہ مضامین شائع
کرنے کی تجویز کی تھی اس مجموعہ میں ہندوستان کے چودہ اکابرین کے
مقالات تھے۔ اسی زمانہ میں احباب کے اصرار پر ہنراکسنی نے یہ
مقالہ تحریر فرمایا۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس میں ہندو مسلم تعلقات سے بحث کی گئی ہے اور اس موضوع کے جملہ مطالب پر یہ مقالہ حاوی ہے۔ نیز اس میں اردو ہندی کے ناگوار قضیہ کا بھی تذکرہ آیا ہے اور ہندو اس کے حل طلب تدابیر پر بہترین روشنی ڈالی ہے۔ غرض کہ ہندو مسلم تعلقات کو برقرار رکھنے کے لئے جو اسباب و علل کارآمد ہو سکتے ہیں ان کے حل کرنے میں ہندوستان کے اس مشہور و معروف مفکر کے افکار و آراء نے انسانی اذہان کی بہترین رہنمائی کی ہے اور خاص کر اس مقالہ کے وہ نکات بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے آئندہ کے لئے دونوں قوموں کے ناگوار تعلقات خوشگوار ہو سکتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ملک کی ترقی اور اس کے مفاد کا واحد ذریعہ ہے افتراق بدترین چیز ہے جس سے نہ صرف بے چینی پھیلتی ہے بلکہ اس سے ملک کا وقار مجروح ہو جاتا ہے۔ اس ہندوستان کے کسی فرقہ کو انکار نہ ہو گا کہ یہ ملک ان کا آبائی وطن ہے جس میں ان کو جینا اور مرنا ہے اور اپنی آئندہ نسلوں کو ملک کی خدمت کے چھوڑنا ہے تو سب کے حق میں بہتر یہی ہے کہ آپس میں میل جول بڑھایا جائے تاکہ تمام قومیں متحد رہیں اس خصوص میں ہندو کشمی کا یہ خیال کس قدر بصیرت افروز ہے کہ ”نفس اصلاح کا تقاضا ہی کثرت میں وحدت چاہتا ہے۔ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپس میں اتفاق اور یکجہتی ہو۔ یعنی منفرد اور

مختلف الاجزاء و حصوں کو سمو کر ایک ایسے متحد الجنس مجموع کی شکل میں ترتیب دینا جو اپنے ماحول کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اگر ہندوستان کی تمام قومیں منافرت دور کر کے صلح و اشتیاق کی زندگی بسر کریں تو یہ امر ہر فرقہ کے حق میں فائدہ بخش ہے اور اسی میں ملک کی فلاح بھی مضمر ہے۔ قومیں اتحاد و عمل کی روشنی میں بڑھتی اور ترقی کرتی ہیں اور جو آرام و اطمینان اتفاق و اتحاد سے میسر آتا ہے وہ بات منافرت سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں امید ہے کہ ہندوستانی کا یہ مقالہ نہایت دلچسپی پڑھا جائیگا اس میں شک نہیں کہ مقالہ کو ضبط و تحریر میں آکر ایک مدت گزرنے پر باوجود اس کے اس مقالہ میں جن امور کی طرف ہندوستانی نے اشارہ کیا ہے وہ اب بھی اصلاح طلب ہیں اس لیے یہ مقالہ اصابت رائے اور خیالات کی بلندی کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور موجودہ تباہ کن حالات کی اس سے بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔

اس مقالہ کا ترجمہ میرے عنایت فرما مولوی و ہاج الدین صاحب شمیم پرنسپل مددگار جناب پرووائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے انگریزی میں اردو میں کیا، جس کے لئے میں موصوف کا شکر گزار ہوں۔

نصدق حسین تاج

{ چارمینار۔ حیدرآباد و مکن
۳۰۔ اپریل ۱۹۳۸ء }

نوٹ:-

۱۹۰۱ء میں مسٹر جسٹس رانا ڈاے آنجہانی کے مشورہ اور ان کی امداد سے مسٹر سی۔ وائی چنتامنی نے ہندوستان کی اصلاح معاشرہ پر ایک مجموعہ مضامین شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں معاشرتی اصلاح کے مختلف پہلوؤں پر چودہ طبعزاد مقالات تھے، جن کے لکھنے والے ڈاکٹر بھنڈارکر، آنر بیل مسٹر انند اچارلو، مسٹر کین، مسٹر دیارام گیدول، مسٹر مدھو لکرو غیر نام تھے۔ تجویز یہ تھی کہ مسٹر رانا ڈاے آنجہانی اس مجموعہ پر ایک مقدمہ لکھیں گے جو جملہ مقالات کے مباحث پر حاوی ہوگا لیکن بدقسمتی سے ان کی قبل از وقت وفات کی وجہ سے یہ تجویز برے کارنہ آسکی چونکہ اب یہ مجموعہ خارج از طباعت ہو چکا ہے اس لئے اکثر احباب کے اصرار پر ”ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات“ پر ذیل کا مضمون جو انہی چودہ مقالات میں شامل تھا، علیحدہ طور پر مکرر شائع کیا جاتا ہے

۱-۲

حیدر آباد دکن
۲۸ مارچ ۱۹۲۵ء

ہندوؤں و مسلمانوں کے تعلقات

میرے زمانہ طالب علمی میں یہ مسئلہ کہ معاشرتی اصلاح مقدم ہے یا سیاسی اصلاح ایک نہایت دلچسپ موضوع بحث تھا۔ اور اخبارات میں اور تقریروں میں اس پر خوب بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ مسٹر جسٹس ٹانگ آنجہانی نے طلباء کے بھی کی بزم ادبی و علمی (Students' Scientific and Literary Society) کے ایک جلسہ میں اس پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا۔ جواب تک میرے دل پر نقش ہے۔ اس مقالہ میں سنجیدہ معقولیت، اصابت فکر اور حسن ادا کی وہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود تھیں جو آنجہانی کا طغرائے امتیاز تھیں اور جن سے قبل انہ وقت محروم ہو جانے کا صدمہ اب تک ہم سب کے دلوں میں ہے۔ ہمارے نظام العمل کا وہ جز جو اس مقالہ کا عنوان ہے ہر دلیل سے زیادہ اس امر کا علمی ثبوت ہے کہ معاشرتی اصلاح کو اگر سیاسی اصلاح پر تفوق نہیں تو کم از زیادہ اہمیت ضرور حاصل ہے۔

جیسا کہ میں کئی موقعوں پر کہنے کی جرات کر چکا ہوں یہ امر واقعہ ہے کہ ”جب تک محکوم طبقہ کے دو بڑے فریقوں میں باہمی حسد اور بدظنی باقی ہے۔ اس وقت تک حکومت بھی مجبور ہے۔ ان دونوں قوموں کی یہ آپس کی مخالفت۔ جو حال میں کئی مرتبہ ہنگاموں اور بلوؤں کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہے اور جس کا السدا و ہمارے پیش نظر سیاسی مسائل میں سے خاص الخاص مسئلہ بن گیا ہے۔ ہمارے ملک اور ہماری مشترکہ جہم بھومی کی ترقی کے راستہ میں سنگ گراں ہے“ ”تا وقتیکہ ہم (مسلمان) اس امر کو بخوبی ذہن نشین نہ کر لیں گے کہ ہم اور اہل ہندو ایک ہی رشتہ و وحدت میں منسلک ہیں اور ہمیں اپنی فلاح و بہبود کے لئے مل جل کر جدوجہد کرنا ہے۔ اُس وقت تک سیاسی اصلاحات کی ہماری ہر کوشش بے کار اور ہر سعی، سعی غیر مشکور ثابت ہوگی۔“

نفس اصلاح کا تقاضا ہی کثرت میں وحدت چاہتا ہے اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپس میں اتفاق اور یک جہتی ہو۔ یعنی منفرد اور مختلف الاجزا و حدتوں کو سمو کر ایک ایسے متحد الجنس مجموع کی شکل میں ترتیب دینا جو اپنے ماحول کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ یہ ماحول اگرچہ گھر کی چار دیواری سے شروع ہوتا ہے، لیکن وہیں تک محدود نہیں رہتا۔

بلکہ نسل اور ملت اور وطن کے تعینات کو سمیٹتا ہوا وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے، حتیٰ کہ کل بنی نوع انسان اور ساری کائنات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مصلح معاشرت کا دائرہ عمل پیغمبر کی حد عمل کے ہمکنار ہو جاتا ہے جو ”دنیوی آسودگی اور کل بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک“ کی منادی کرتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ”ہندوستانی مصلحان معاشرت“ کے نظام عمل کے مختلف اجزاء، ”سیاسی شورش پسندوں“ (اس لفظ سے تنقیص مد نظر نہیں ہے) کے مزعومہ مطالبات حقوق، تحصیص صوفی جدوجہد کی ساری شگوفہ کاریاں (یہاں تحصیص صوفی کے وسیع ترین معنی مراد ہیں۔ کسی خاص ادارے کی طرف اشارہ نہیں ہے) ان سب کی کل اہمیت اور ان کا تمام تر جواز صرف اسی قدر ہے کہ یہ سب گویا قدم ہیں جو اکثر بہت رک رک کر، اور عموماً غیر ارادی طور پر اٹھتے ہیں لیکن ہمیں بتدریج اس منزل مقصود کے قریب کرتے رہتے ہیں، جو اگرچہ ابھی بہت دور ہے، لیکن جہاں پہنچکر ہم عورتیں اور مرد سب خود دار بن جائیں گے اور ہمارا ملک ریاست ہائے وفاق برطانیہ کے دوسرے خود مختار اجزاء کی طرح اور انہی کے دوش بدوش، جگہ پانے کا مستحق ہو جائے گا۔

اگر بالآخر ہماری یہ امید بر نہ آئی تو سمجھنا پڑے گا کہ

ہندوستان کی عنان شہنشاہیت کا ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں جانا جو اپنی سیرت 'تاریخ' اور روایات کے اعتبار سے اقوام ہند کی تعلیم اور ان کے احیاء کے لئے (بمقابلہ دیگر اقوام عالم) سب سے زیادہ موزوں تھی گویا ایک بے فشا اور بے مقصد چیز تھی، خصوصاً جب یہ یاد رکھا جائے کہ شہنشاہیت کی منتقلی کا یہ عمل اس قدر غیر شعوری طور پر اور بظاہر علی الرغم حالات و خواہشات واقع ہوا ہے کہ مذہبی خیال کے لوگوں کو صریحاً اس کی تاریخ میں مشیت الہی کا فرما نظر آتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وحدت اور ہم آہنگی کی وہ زبردست قوتیں جن کا ذکر میں نے کیا ہے، برطانوی اقتدار ہی کی رہن سنت ہیں، بلکہ ان کا تصور، اور ان کے حصول کا امکان بھی اسی اقتدار کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ قوتیں کیا ہیں؟ حقیقی امن عامہ، مساوی قوانین، غیر جانبدارانہ عدالت، بعد مرگافی مٹانے والی رییس، وقت کو مسخر کرنے والی تاریہ، اور ان سب سے بھی بڑھ کر اخلاق آفرین اور ولولہ خیز ادبیات جس نے اکابر عالم کے افعال، اقوال، اور حالات کے دروازے ہم پر کھول دیے ہیں۔

دوسری طرف باوی النظر میں یہ معما بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ گویا اسی برطانوی اقتدار کی وجہ سے ہندوستان کی دو بڑی قومیں

اختلاف باہمی کے کچھ نئے اجزا بھی پیدا ہو گئے ہیں، یعنی ایسے اجزا جو فی نفسہ اہمیت سے خالی ہیں، لیکن ان کا اثر بہت زیادہ لیا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو تعلیم کو حصول ملازمت کا واحد معیار نہیں تو بھی خاص معیار بنا دینے سے ہندوؤں کو اس اثر و اقتدار کے حاصل کرنے میں جو پہلے انھیں سوائے مغربی ہندوستان کے اور کہیں حاصل نہ تھا، فائدہ پہنچا ہے۔ اور اسلامی فتوحات ہندوستان کے ان تعصب آمیز اور راج الج الوقت بیانات کو ٹھکر جھنیں بد قسمتی سے تاریخ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی نئی نسلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ پرانے بدلے لئے جائیں (صاف بیانی معاف ہو) جو ان کی رائے میں محمود غزنوی کے زمانہ سے لے کر اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان کے زمانے تک کے باقی ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں میں جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے اثر و اقتدار کو مٹتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، وہ بنیادی جو پہلے انگریزوں کی طرف سے تھی اب ہندوؤں کے ساتھ پیدا ہونی جا رہی ہے جو اس دوڑ میں ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ایک طرف تو ہندوؤں میں اسلامی عہد حکومت کے جو پہلو سب سے زیادہ قابل اعتراض تھے ان کی تلخ یاد اور اس سے پیدا ہونے والا شدید جذبہ انتقام اور دوسری طرف مسلمانوں کا برابر سرکاری ملازمتوں سے

محروم ہوتے جانا (جو زیادہ تر خود انہی کی عدم قابلیت و اتفاق کا نتیجہ ہے) اور اس سے پیدا ہونے والا جذبہ حسد یہ دو اجزاء باہمی اتفاق کے خاص النحاص اسباب ہیں اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جن علاقوں میں اسلامی اثر کم سے کم پایدار رہا ہے یا جہاں کاروبار تجارت جس سے سرکاری ملازمت کے مقابلہ کی تیزی کم ہو جاتی ہے، سب سے زیادہ بڑھا ہے وہاں دونوں قوموں کے تعلقات اور سب علاقوں سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ اگر یہ جواب دیا جائے کہ ان علاقوں کے مسلمان باعتبار سیرت، نسل اور احساسات ہندوؤں ہی کی طرح ہیں تو یہ واقعہ کہ انگریزی تعلیم کی ترویج نے انہیں اپنے ہندو بھائیوں سے کسی قدر جدا کر دیا ہے، ہماری مذکورہ بالا رائے کا مزید ثبوت۔ سوال یہ ہے کہ ان مرکز گریز قوتوں کے اثر کو زائل کس طرح کیا جائے؟ بطور ذیل میں میں نے بعض ایسے عوامل کا ذکر کیا ہے جس سے میری رائے میں یہ مطلب حاصل ہو سکتا ہے، اور اگر میرا رائے سخن زیادہ تر ہندوؤں کی طرف ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں گزشتہ حالات کا زیادہ تر ذمہ دار انہیں قرار دیتا ہوں، نہیں، بلکہ صرف اس لئے کہ بحیثیت تعلیمی اور ترقی یافتہ اکثریت ہونے کے مستقبل کے بارے میں انکی ذمہ داری زیادہ ہے اور دونوں قوموں میں رابطہ استحاد

پیدا کرنے کی طرف موثر ترین اقدام وہی بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں۔
 ۱۔ سب سے پہلا عامل ملکی پریس ہے۔ اسے اس امر کا حقیقی
 احساس ہونا چاہئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی خوشگوار
 تعلقات کا ہونا بدرجہ اتم ضروری ہے۔ آج کل تو ایک دوسرے
 کے مطالبات پر تلخی اور بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کرنے کا
 رجحان بہت بڑھا ہوا ہے۔ خاص طور پر یہ سلوک ہندو پریس کی
 جانب سے مسلمانوں کے مطالبات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جس
 کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ اکثر صورتوں میں یہ مطالبات غیر
 واجب اور مبالغہ آمیز ہوتے ہیں اور ناگوار طریقہ پر پیش کئے جاتے
 ہیں، لیکن میری رائے یہ ہے کہ ان صورتوں میں بھی زیادہ ضرورت
 اس بات کی ہے کہ کھل اور ہمدردی سے کام لے کر، مبالغہ
 آمیزی اور بے باکی کی نرمی کے ساتھ اصلاح کر کے مطالبات کو
 زیادہ واجب اور کم تشدد آمیز پیرایہ میں پیش کرنے کے طریقے
 بتائے جائیں۔ مثلاً مسلمانوں کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ اعلیٰ تر
 ملازمتوں میں ان کی نمائندگی زیادہ ہونی چاہئے۔ اب یہ ضروری
 ہے انصافی کی بات ہے کہ کسی ایک اسلامی انجمن کے مطالبہ کو
 یہ کہہ کر اچھا لاجائے کہ مسلمان تو یہ چاہتے ہیں کہ وہاں ملازمت کا
 معیار ان کے لئے کم کر دیا جائے اور اس چیز کو نہ دیکھا جائے
 کہ وہ دار اسلامی انجمنوں کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ براہ راست

اور باقاعدہ طور پر ایک مخصوص تعداد میں ایسے مسلمانوں کو گریجویٹوں کو ملازمتیں دیکجا میں جن کے پاس یونیورسٹیوں کی یا ان کالجوں کی جہاں انھوں نے تعلیم پائی ہے، یا ایسے افسران سررشتہ کی جن کی ماتحتی میں انھوں نے کام سیکھا ہے، باقاعدہ تصدیقیں اور سندیں ہوں۔ مختصر یہ کہ پریس میں اتنی وسیع النظری ہونی چاہئے کہ وہ ایک کم ترقی یافتہ جماعت کے اغراض و مفاد کو سب جماعتوں کے مفاد کا لازمی وسیلہ اور تہمتہ سمجھے۔

۲۔ ہی اصول ہر اجیر کے بھی، خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، پیش نظر رہنا چاہئے۔ اسے اپنے جملہ ماتحتین کے مفاد کی پوری نگہداشت کرنی چاہئے۔ اور انروئے انصاف ترقی و صلہ کارگزاری کے بارے میں کسی قسم کے اثرات قبول نہ کرنے چاہئیں۔ اسے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اپنے دفتر کو اس اتحاد قلبی کا (جس کا میں خواستگار ہوں) مرکز استحکام یا محل انتشار بنانا اس کے ہاتھ میں ہے۔ استحقاق کی ایک حق تلفی یا ایک مستحق اسد وار فضل و کرم کی امداد اس مقصد نیک کو برباد کرنے یا ترقی دینے میں متعدد تقریروں یا مقالوں سے زیادہ موثر ہو سکتی ہے۔

۳۔ ابھی حال میں شمالی ہندوستان میں اردو ہندی کا جو تلخ قضیہ کھڑا کیا گیا ہے اس کی روشنی میں ایک اور تجویز

پیش کرتا ہوں جس سے بجائے کبیدگی کے حقیقی محبت پیدا ہو سکتی ہے۔ میں لسانی حیثیت سے اس مسئلہ کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا اور نہ اس سے بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کا جو موجودہ حل اختیار کیا گیا ہے، اس سے ان لوگوں کو جو اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ کس حد تک فائدہ ہوگا۔ اگرچہ یہ خیال ایک حد تک قرین قیاس ہے کہ اگر موجودہ صورت حال ہی قائم رہتی تو اس سے مشترکہ زبان کا مقصد جو ہر شخص کو عزیز ہے، پورا ہو جاتا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس تبدیلی سے جن فوائد کی امید ہو سکتی ہے وہ اس رنجش و کدورت کو دیکھتے ہوئے جو دلوں میں پیدا ہو گئی ہے، گراں پڑے ہیں۔ موجودہ صورت حالات سے ہندوؤں کو جو وقتیں ہوتی تھیں وہ سات برس پہلے کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تو نہیں تھیں، اور جہاں تک مجھے علم ہے، اس زمانے میں یہ مسئلہ اٹھایا تک نہیں گیا تھا۔ لیکن اس واقعہ سے دونوں قوموں کے درمیان جو بعض مخالف اثرات کے مٹ جانے کی وجہ سے، اور اس سے بھی زیادہ قحط اور وباء کے مشترکہ سبق آموز مصائب کا شکار ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ جدائی کی ایک خلیج حائل ہو گئی ہے جس کے بھرنے میں برسوں گزر جائیں گے۔ جب ایک قوم کے جذبات مشعل ہو گئے ہوں تو کیا ایسی صورت میں دوسری

قوم کے قائدین کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ مفاد عامہ اور
 اور خیر بیشتر کے اصول کو سامنے رکھ کر از خود مجوزہ تبدیلی کے
 المتواء کی خواہش کریں، خصوصاً جب کہ اس تبدیلی سے ایک
 دیرینہ صورت حال میں خلل واقع ہوتا ہو؟ اگر صرف اس ایک
 مسئلہ میں یہ نقطہ نظر اختیار کیا جاتا، تو کیا اس سے دوسرے متعدد
 مسائل بحسن و خوبی طے نہ ہو جاتے، کیونکہ ایک قوم کا تھوڑی
 سی قربانی برداشت کر لینا، اس کی حقیقی خواہش دوسری کو دوسری
 قوم پر ثابت کر دینا ہے۔ ۱۸۸۶ء کی کانگریس منعقدہ در اس
 میں مسٹر جسٹس طیب جی کی تحریک پر یہ قرار دیا و منظور ہوئی تھی
 کہ جس مسئلہ کو کوئی ایک قوم غلبہ آ رہا ہے اپنے مفاد کے منافی سمجھے
 اس پر کوئی بحث نہ ہونی چاہئے۔ میری رائے میں ہمارے جملہ
 قائدین کو بھی اسی قسم کی کسی قرار داد کو قبول کر کے اس پر پوری
 طرح کار بند ہونا چاہئے۔

۲۔ ایک اور امر جس کی طرف میں توجہ مبذول کرانا چاہتا
 ہوں وہ حالیہ رجحان ہے جو فرقہ وارانہ ادارات خصوصاً قوم
 کے مختلف طبقوں کے لئے جداگانہ مدارس اور کلیات قائم کرنے
 کے بارے میں دیکھا جا رہا ہے۔ مسٹر بیسٹ کا بنارس کا ہندو
 کالج اس رجحان کی جدید ترین مثال ہے۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی
 اس حقیقت سے غافل نہیں ہوں کہ کسی خاص قوم کی اپنی مخصوص

ضروریات کا انتظام ہونا چاہئے، لیکن میں ایسے ادارات کے قیام کو جن سے دوسری قوموں کے افراد کو دور رکھا جائے، قابل افسوس سمجھتا ہوں۔ علی گڑھ کالج سے ہندوؤں کو علیحدہ رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر بنارس کالج بھی اسی روشن خیال پالیسی پر کاربند ہوتا! مدارس اور کالجوں کی جمہوریت ہی، اور سب چیزوں سے کہیں زیادہ، فرقہ وارانہ اختلافات اور امتیازات کو مٹاتی ہے، اور اس کا اثر قومی زندگی کے وسیع تر میدان پر بھی پڑتا ہے۔ مدرسوں اور کالجوں میں دوستی اور محبت کے جو رابطے مستحکم ہوتے ہیں وہی سب سے زیادہ موثر طریقہ ہر طبقہ اور ہر ملت کے تعلیم یافتہ افراد میں باہمی مفاہمت اور یکانگت پیدا کرتے ہیں۔ انجمن اصلاح معاشرت (Social Reform Conference) کی قسم کی تحریکیں بھی اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہیں جب طبقہ وارانہ مجالس میں ہر فرقہ کی مخصوص ضرورت پر غور کرنے کے بعد، ہندو اور مسلمان نمائندوں کی ایک مشترکہ مجلس میں مشترک خامیوں، اور عام اصولوں پر بھی غور و خوض کیا جائے۔

۵۔ اتفاق و اتحاد کی جانب ایک اور قدم اس طرح اٹھایا جاسکتا ہے کہ دونوں قومیں باقاعدہ طور پر اور بالاراہ

اس ضرورت کو تسلیم کر لیں کہ انھیں عملی حیثیت سے ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا پاس اور لحاظ کرنا چاہئے۔ مثلاً کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان قائدین حتی الامکان گاؤں کشی کی روک تھام کی عملی کوشش نہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قربانی کچھ ایسی زیادہ سخت نہ ہوگی، لیکن اس سے مسلمانوں کے مفاد کے ساتھ جو ہمدردی پیدا ہو جائے گی وہ نہایت قابل قدر ہوگی۔ دوسری طرف کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسجدوں کا بجا طور احترام کرنے کے بارے میں ہندو قائدین اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ شرکت عمل نہ کریں۔

۶۔ سب سے آخری، لیکن سب سے زیادہ نتیجہ خیز عامل ادبیات ہے۔ آج کل ہندوؤں کی اکثر تصانیف میں ہر قسم کی مذہبی بے حرمتی، بد عملی، اور برائی کا اتہام مسلمانوں پر رکھا جاتا ہے۔ اس بارے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے سب سے بڑے مفکر کے (جس کی وسعت ذہنی سارے ہندوستان کے احیاء پر حاوی ہے اور جس کی تقریریں ہر سال اس احیاء کے مختلف پہلوؤں پر کے بعد ویکٹریس اس قدر بصیرت افروز روشنی ڈالتی رہتی ہیں) لکھنؤ کے خطبہ کو پیش نظر رکھ کر تحقیقات کے جو فاضلانہ اسلوب اس میں بتائے گئے ہیں، ان پر مزید کام کریں۔ اس کا ایک نتیجہ

یہ ہوگا کہ تاریخ ہند پر ایسی مناسب نصابی کتابیں تیار ہو جائیں گی جن میں اسلامی حکومت ہند پر ہمدردانہ بحث ہوگی اور مسلمانوں نے ہندی تہذیب کے فروغ میں جو حصہ لیا ہے وہ ظاہر ہوگا اور اس طرح دونوں قوموں کی باہمی کدورت کا شدید ترین سبب جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے، مٹ جائیگا۔

تفاق انگیز اثرات کو زائل کرنے کے لئے جو علاج ہو سکتے ہیں ان میں سے صرف چند سطور بالا میں پیش کئے گئے ہیں۔ اگر اس مسئلہ پر اس قدر توجہ صرف کی جائے جتنی باعتبار اس کی اہمیت کے ہونی چاہئے تو بلاشبہ اور کئی علاج بھی سمجھ میں آ سکتے ہیں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میری رائے میں ایک ہندوستانی کا مقدس ترین فرض یہ ہے کہ وہ اس وسیع براعظم میں بسنے والی مختلف نسلوں اور قوموں کے دلوں کو ایک ہی ارشتہ اتحاد میں منسلک کر دے، یہ اتحاد صرف یہی نہ ہو، کہ ہندو اور مسلمان اور پارسی اور عیسائی ایک دوسرے کے وجود کو گوارا کرنے لگیں، یا ایک شان بے تعلقی کے ساتھ رہیں، نہیں، بلکہ ایک زندہ اور عملی اتحاد ہو، ایک دوسرے کو بھائی سمجھیں جو سب اپنی مشترکہ ودیعت کے فروغ کے لئے یکجہتی اور یگانگت کے ساتھ سرگرم عمل ہوں۔

تین افسانے

— (مرتبہ تصدق حسین تاج) —

آنریبل سر شیخ عبدالقادر بی اے بیرسٹر ایٹ لا
ممبر انڈیا کونسل لندن

اُردو کے اُن چند ادیبوں میں سے ہیں جن کے نام انگریزوں پر
گئے جاتے ہیں آپ نے اردو زبان کی جس خلوص اور سرگرمی سے خدمت
کی ہے اس سے ہندوستان کا علم دوست طبقہ بخوبی واقف ہے آپ نے
اپنے سینکڑوں بلند پایہ مضامین سے اردو کا دامن مالا مال کر رکھا
جن میں صرف تین افسانے ملتے ہیں جو کچا کٹاپی صورتیں شائع کئے گئے ہیں
پہلا افسانہ "تاجدار بیوی کا بے تاج شوہر" انگریزی کا ترجمہ ہے
دوسرے دو افسانے "وطن آخر وطن ہے" اور "ول ہی تو ہے" انگریزی کے
شاہکار ہیں۔ کاغذ و طباعت نہایت عمدہ سرورق رنگین قیمت ۶۔

ملنے کا پتہ

احمدیہ پریس چارمینار حیدر آباد دکن

نظم اقبال

سفر حیدرآباد دکن اور سر اقبال کے تاثرات ۱۹۱۱ء میں

حیدرآباد سے متعلق علامہ اقبال کی نظمیں اور تحریریں

دکن سے متعلق ایک ادبی اور تاریخی یادگار

قیمت ۴/-

ملنے کا پتہ: احمدیہ پریس چامینا حیدرآباد دکن

ناشر تصدق حسین تاج محمد انجمن اشاعت اردو

چامینا حیدرآباد (دکن)